اردو کی نشو ونما میں

صوفیائے کرام کا حصّہ

مولوی عبدالحق

سوال ا :- اردو کے آغاز وارتقاء پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالئے۔

جواب :- شمالی ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح اردو بھی ایک ہند آریائی زبان ہے۔ یہ اسی ملک میں پیدا ہوئی، یہیں پھولی اور پروان چڑھی۔ شورسینی پراکرت کے حدود دار بعہ تھے۔ جو قدیم آریائی دور میں مدھ دیش کے تھے اور جہاں سنسکرت پروان چڑھی تھی اور غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو مدھ دیش کی اسی قدیم زبان کی آخری کڑی ہے۔

اردو کی ابتداء یا اس کا آغاز مسلمانوں کی دلی میں آمد سے تقریباً دو سال قبل ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ شروع ہو چکا تھا۔ یہ ضروری ہے کہ ۱۱۹۳ء کے بعد اس کی ترقی کی رفتار تیز ہوگئی اور آہستہ آہستہ اس پر نکھار آنے لگا۔

شورسینی اپبھرنش کے چولا بدلنے کے بعد آہستہ آہستہ جس زبان کے خدوخال نمایاں ہونا شروع ہوئے اور جو زبان پورے دو سو سال تک شمالی ہند میں ابھرتی رہی وہ اردو ہی تھی۔ جس کے باقاعدہ آغاز وارتقاء کی تاریخ تیرہویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ سترہویں صدی عیسوی کے پورا ہونے تک اردو اپنے لسانی ارتقاء کا ایک دور پورا کر لیتی ہے۔ اٹھارہویں صدی سے اپنے ارتقاء کے دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے۔

اردو کے باقاعدہ آغاز کی تاریخ ۱۱۶۳ء تسلیم کی گئی ہے۔ یہ فتح دلی کی بھی تاریخ ہے۔ جب مسلمانوں نے پنجاب سے آکر پہلی بار دہلی کو اپنا مستقر بنایا۔ ان نواردوں میں عربی داں بھی تھے اور فارسی و ترکی بولنے والے بھی۔

لیکن کثیر تعداد ان تارکین وطن کی تھی جن کی مادری زبان پنجابی تھی۔ دہلی اور نواح دہلی کی چار بولیاں ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی پہلے ہی سر چکی تھی۔ مختلف مقامی اور غیر مقامی، لسانی دھاروں کے سنگ یا لسانی امتزاج سے زبان کی جو نئی شکل معارض وجود میں آئی، وہ ابتدائے ریختہ ہندوی، ہندی اور بعد میں اردو کہلائی۔ اگر چہ ہزار عیسوی سے کسی نہ کسی شکل میں اردو موجود تھی۔ لیکن ایک

Scanned with CamScanner

امتیازی زبان کی حیثیت سے اس کے آغاز وابتداء کی تاریخ ۱۱۶۳ء ہی تسلیم کی گئی۔

شمالی ہند میں اپنے ارتقاء کی ایک صدی مکمل کر لینے کے بعد یہی زبان ۱۲۹۵ء میں دکن پہنچی۔ جہاں اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) تک یہ آزادانہ طور پر پھیلتی اور پروان چڑھتی رہی۔ دکن اور شمالی ہند میں ۱۲ ارسوعیسوی تا چودہ سوعیسوی کے دوران جس زبان کا ارتقاء ہوا اسے ہم قدیم اردو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

شمالی ہند میں قدیم اردو ے ابتدائی نمونوں کا فقدان ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ تیرہویں، چودہویں، پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے دوران شمالی ہند میں ارتقاء پذیر ہونے والی زبان کا ایک بھی مستند نقش دستیاب نہیں۔ جب کہ اسی زبان نے دکن پہنچ کر تقریباً اس ہی صدیوں کے دوران قابل قدر تصانیف کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ مثلاً حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (معراج العاشقین) شاہ میراں جی شمس العشاق (شہادت الحقیقت) شاہ برہان الدین خانم (ارشاد نامہ) محمد قطب شاہ (کلیات محمد قلی قطب شاہ) ملاّ وجہی (سب رس) غواصی (سلف الملوک و بدیع الجمال) محمد امین ایاغی (نجات نامہ) نصرتی (گلشن عشق) علی عادل شاہ ثانی (کلیات شاہی) ابن نشاطی (پھول بن) قاضی محمد بحرن (من لگن) وجدیؔ (پنچھی نامہ) ولیؔ دکنی (کلیات ولیؔ) وغیرہ۔

شمالی ہند میں اردو کے بالکل ابتدائی نمونے صوفیائے کرامی کے ملفوظات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جو مختلف تذکروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے انہیں جمع کر کے کتابی شکل میں ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام'' کے نام سے شائع کر دیا۔

شیخ فریدالدن گنج شکرؒ، حمیدالدین ناگوریؒ، شیخ بہاءالدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر، شیخ شرف الدین یحیٰ منیری وغیرہ ان چند بزرگوں میں سے ہیں جن کے نام اردو کی ابتدائی نشو ونما کے سلسلے میں ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ بابا فریدالدین گنج شکرؒ سے منسوب ''شبدہ'' سکھوں کی مذہبی کتاب ''گروگرنتھ صاحب'' میں بھی شامل ہیں۔

قدیم اردو کے سب سے پہلے اور اہم مصنف حضرت امیر خسرو تسلیم کئے گئے۔ جنہوں نے اپنی غزلیں اور پہیلیاں، زبان دہلوی میں تصنیف کیں۔ امیر خسرو کی شاعری کے بعد شمالی ہند میں پورے چار سو سال تک مکمل سناٹا چھایا رہتا ہے۔ اس طویل عرصہ تک خاموشی کے بعد تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں پھر سے ادبی شعور کی روح بیدار ہوتی ہے اور از سر نو شعری فضا قائم ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ جس کا ثبوت محمد افضل کی ''بکٹ کہانی'' ہے جسے پروفیسر مسعود حسین خان نے بجا طور پر شمالی

Scanned with CamScanner

ہند میں اردو کا پہلا نمونہ قرار دیا ہے۔ ''بکٹ کہانی'' کے بعد شمالی ہند کی دوسری اہم تصنیف ''عاشور نامہ'' ہے۔ جو واقعات کربلا سے متعلق ایک نہایت طویل نظم ہے اور جس کے مصنف روشن علی سہارن پور کے باشندہ ہیں۔ ''عاشور نامہ'' کا سال تصنیف ۱۶۸۸ء ہے۔ ''عاشور نامہ'' کی زبان سترہویں صدی عیسوی کے اوخر کی وہ زبان ہے جو موجودہ مغربی یوپی کے بالائی دواب میں رائج ہے۔

''مراثی کا ریختہ'' کا تعلق بھی غالباً اسی دور سے ہے۔ یہ مرثیے شمال کے مختلف شعراء کے لکھے ہوئے ہیں۔ جن میں چند کے نام یہ ہیں۔ قربان علی صلاح اور قاسم وغیرہ۔ سترہویں صدی کے آخری اہم تصنیف اسماعیل امروہوی کی دو قدیم مثنویاں ہیں جنہیں شمالی ہند میں قدیم اردو کی آخری کہنا بے جا نہ ہوگا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کے زوال کی ایک طویل داستان شروع ہوتی ہے۔ یہی زمانہ اردو ادب کے مکمل ارتقاء اور پورے عروج کا زمانہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں فارسی کا زوال بھی شروع ہوا۔ جب فارسی روبہ زوال ہوتی نظر آئی تو شمالی ہند کے فارسی شعراء اردو میں شعر کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح بول چال کی زبان کے علاوہ اردو ادب شعری وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے بھی پہچانی جانے لگی۔ تاہم اس کی ترقی کی رفتار بہت مدھم رہی اور ادبی زبان کی حیثیت سے یہ کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہ دے سکی۔ عین اسی موقع پر دکنی کی آمد کا دلی میں اعلان ہوا۔ دلی کے اردو کلام کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے دیوان کی دلی کے ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور ان کے اشعار گلی کوچوں میں گنگنائے جانے لگے۔ اس ادبی جوش وخروش سے شمالی ہند میں ایک نئے ادبی انقلاب کا آغاز ہوا۔

شمالی ہند میں بدقسمتی سے نثر کے نمونے کی بڑی کمی ہے۔ اردو کے آغاز سے لے کر ۱۷۰۰ء تک اس زبان میں شمالی ہندوستان کی نثر کا کوئی بھی نمونہ دستیاب نہیں۔ قدیم اردو کا تمام تر سرمایہ شعری ادب پر مشتمل ہے۔ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی سے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو زبان میں اخلاق وتصوف کے موضوع پر ایک رسالہ ۱۲۰۸ء میں قلم بند کیا تھا۔ لیکن آج تک کسی کو علم نہ ہو سکا کہ یہ رسالہ کہاں موجود ہے۔ شمالی ہند میں نثری تصانیف کا سلسلہ صحیح معنوں میں اٹھارہویں صدی کے دوسرے ربع سے شروع ہوتا ہے۔ اردو میں نثر کی پہلی کتاب ''کربل کتھا'' ہے۔ جس کے مصنف فضل علی فضلؔ ہیں۔ یہ کتاب ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی۔ یہ ملاّ واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضتہ الشہداء'' کا ترجمہ ہے۔ اس سے قبل کوئی ترجمہ شدہ یا مستقل نثری تصنیف شمالی ہند میں اب تک دستیاب نہیں ہوئی

Scanned with CamScanner

ہے۔ شمالی ہند کی دوسری تصنیف عیسوی خان بہادر کی ''قصہ مہر افروز دلبر'' ہے۔ جس کا سال تصنیف ۱۷۵۹ء ہے۔ اس کے تقریباً چالیس برس بعد عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرصّع'' منظر عام پر آئی۔ جو فارسی کے مشہور قصے ''چہار درویش'' کا ترجمہ ہے۔ ان نثری تصانیف اور قرآن مجید کے چند ترجموں کے علاوہ ۱۸۰۰ء کے دوران نثر کی ایک بھی کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔

ولی کی دلی اور شمالی ہند میں اردو شاعری کے ارتقاء کے بعد تاریخ زبانِ اردو کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اور اردو اپنی لسانی قدامت کا چولا بدل کر اپنے ارتقاء کے دور میں داخل ہوتی ہے۔ جس کے اوّلین نمونے جعفر زٹلی، فائز دہلوی اور عیسوی خان بہادر کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان مصنفین کے علاوہ اٹھارہویں صدی کے نصف میں اردو کے نصف متقدمین شعراء حاتم، یکرنگ، مضمون، آبرو، منظر اور ناجی وغیرہ بھی شمار میں آتے ہیں۔ ان کی زبان کو نہ تو ہم قدیم کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی پورے طرپر جدید۔ اس صدی کے آخر نصف حصے کے قدیم شعراء مثلاً میر تقی میر، میر درد، میر سوز، مرزا محمد رفیع سودا وغیرہ کے ساتھ اردو کے ارتقاء کا دوسرا دَور بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور میر تقی میر کے انتقال یعنی انیسویں صدی کے آغاز سے اردو اپنے لسانی ارتقاء کے تیسرے اور جدید دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف جدید اردو کا اوّلین نقش ہیں۔

اردو کے آغاز ارتقاء پر غور کرتے وقت جس طرح ہم دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں سے صرف نظر نہیں کر سکتے، اسی طرح ان بولیوں کے بولنے والوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مقامی بولیاں بولنے والوں میں تقریباً سب ہی غیر مسلم اور محکوم تھے۔ سیاسی وسماجی مفاد اور باہمی ضروریات کے پیش نظر ان کے لئے حکمران طبقے کی زبان سیکھنا اور اس میں درک ومہارت پیدا کرنا لازمی تھا۔ چنانچہ مقامی باشندوں کے بااثر طبقے نے حکمران طبقے کے سامنے سرخرو ہونے اور سلطنت میں اعلیٰ عہدے اور مناصب حاصل کرنے کے لئے فارسی سیکھنی شروع کی۔ اس طرح مقامی باشندوں کا ایک بااثر طبقہ دو لسانی بن گیا۔ بقول مولوی عبدالحق :-

> ''ہندوؤں نے تو اس کے حاصل کرنے میں بڑا کمال دکھایا۔ ان میں فارسی کے ایسے ادیب اور شاعر ہیں کہ ان کی بعض تصانیف اب تک مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اور مدتوں داخل نصاب رہیں۔ متواتر مطالعہ، مشق شعر وسخن، روزمرّہ کی نوشت وخواند، صحبتِ اہل علم نیز اس وقت کے ماحول اور رواج سے فارسی ان کے دل ودماغ میں رچ بس گئی تھی اور تقریباً ان کی اپنی زبان ہوگئی تھی۔''

Scanned with CamScanner

چونکہ فارسی وہ لوگ سیکھ چکے تھے، اس لئے اپنی بول چال کی زبان میں بھی وہ فارسی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرنے لگے۔ اس طبقے کے زیر اثر اور حکمران طبقے کے ساتھ میل جول کے باعث عوام کی زبان میں عربی فارسی اور ترکی الفاظ شامل ہونے لگے۔ اس طرح لسانی خلط ملط کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا اور دھیرے دھیرے ایک نئی زبان کا ڈھانچہ تیار ہونے لگا۔ جو ہندوئی، ہندی اور پھر اردو کہلایا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اردو کو پہلے ''ہندی'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ غالبؔ نے بھی اپنی تحریروں میں اردو کے لئے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے آغاز وارتقاء کا سہرا مقامی باشندوں کے سر ہے۔ جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مولوی عبدالحق نے بھی اپنے ایک صدارتی خطبے میں اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

> ''اردو خاص ہندوستان کی پیداوار اور دونوں قوموں یعنی ہندو مسلمان کے لسانی، تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بنانے والے زیادہ تر ہندو ہیں۔''

اردو کی ساخت یہ بتاتی ہے کہ اس کا پورا قواعدی ڈھانچہ مقامی بولیوں کا ہے۔ صرف ذخیرۂ الفاظ کا کچھ حصہ فارسی اور عربی الفاظ پر مشتمل ہے۔ اگر اردو صرف مسلمانوں کی ساختہ ہوتی، تو اس کا بنیادی ڈھانچہ فارسی وعربی یا ترکی زبان کا ہوتا اور باہمی میل جول کی وجہ سے اس میں صرف تھوڑے سے الفاظ دیسی بولیوں کے شامل ہو گئے تھے۔ لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے آغاز وارتقاء اور اس کے فروغ میں مقامی باشندوں نے زیادہ حصہ لیا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اردو کے عروج کا زمانہ فارسی کے زوال کا دَور ہے۔ فارسی کے زوال کے بعد مسلمانوں نے مکمل طور پر اردو کو اپنا لیا۔ جو عوامی، مقامی، بازاری اور لشکری زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ مشہور مؤرخ تاراچند نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے :-

> ''سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک لسانی متزاج وجود میں آیا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی ترکی اور فارسی ترک کر کے ہندوؤں کی زبان اختیار کر لی۔''

ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوؤں کی زبان کیا تھی۔ یہی اردو جس کا پرانا نام ہندوئی اور ہندی تھا۔ اس طرح ہندو مسلم عوام کے بہترین وسیلہ اظہار اور مشترکہ تہذیب کی علامت کے طور پر وجود میں آئی۔ اردو آج بھی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علمبردار اور قومی یکجہتی کی امین ہے۔

Scanned with CamScanner